Majallah Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 35, Sr.No.96, 2014, pp 35 - 48

مجلہ تحقیق
مجلّہ کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۵، جولائی۔ستمبر ۲۰۱۴ء، شمارہ ۹۶

ترجمہ کی اہمیت اور کلامِ غالب کے اہم منظوم پنجابی تراجم

ڈاکٹر ثمن زاہد☆

Abstract:
The significance and importance of literary translations is known to all literary critics and most of them recognize it as a creative work. A true translation actually creates bridges among nations and brings them closer to each other. In Sub-continent's literary tradition, translations have created great impact. Mirza Asadullah Khan Ghalib is one of the most celebrated poets of Indo Pak Sub-continent. In This research article, the Punjab translations of his poetry have been intoduced and critically evaluated. in addition to that the researcher has also thrown light on importance of literary translations.

Key words: Translations, Importance, Significance, Mirza Ghalib's poetry, Punjabi Translations, Analysis.

عہدِ جدید میں زندگی گزارنے کیلئے ایک دوسرے سے اور اپنے اردگرد سے باخبر رہنا لازمی ہوگیا ہے۔ ہر زبان کو وجود میں آنے کے بعد اپنے ابتدائی مدارج طے کرنے کے ساتھ ساتھ جدید دور کے حالات وواقعات سے رابطہ رکھنے کیلئے بھی دوسری زبانوں کا سہارا لینا پڑتا ہے یہ سہارا اسے تراجم کی سیڑھی کے ذریعے ہی ملتا ہے۔

☆ لیکچرر، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، کوٹ خواجہ، لاہور

لفظ ''ترجمہ'' پر غور کیا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ یہ اپنے اندر نہایت وسعت لئے ہوئے ہے۔ اسی وسعت اور پھیلاؤ کے باعث اس کی کوئی جامع و مانع تعریف کرنا مشکل ہے۔ تاہم مختلف اہلِ علم وفن نے اپنے اپنے انداز سے اس پر بحث کی ہے۔ بقول عطش درانی:

''کسی ایک زبان (مآخذ) کے متن کے متبادل کے طور پر دوسری زبان (ترجمہ) کا متن پیش کرنا ترجمہ کہلاتا ہے۔''(1)

مرزا حامد بیگ کی رائے میں:

''ترجمہ کسی متن کو دوسری زبان میں منتقل کرتے ہوئے اس کی تعبیر کرتا ہے یعنی ترجمے کا عمل ایک عملی یا ادبی پیکر کو دوسرے پیکر میں ڈھالنے کا نام ہے۔''(2)

گویا ترجمہ نگاری ایسا عمل ہے جس میں ایک زبان کے سرمایہ علم وادب کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ اردو کے اہل زبان دانشوروں نے اس پر مختلف وضاحتی پیرایۂ بیان اختیار کئے ہیں جس کو پڑھ کر نہ صرف اس فن کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے نظر آتے ہیں بلکہ ادب کے دائرہ کار میں اس کی اہمیت وافادیت بھی واضح طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً:

''ترجمہ اصولی طور پر نرگسیت اور خود پسندی کی ضد ہے کیونکہ ترجمہ کسی دوسرے شخص کی تخلیق سے رابطہ قائم کرنے کا نام ہے۔''(3) یا:

''ادبی قدر و قیمت ترجمے کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ایک زبان سے دوسری زبان میں مفہوم کے ساتھ وہ آب و رنگ، وہ چاشنی، وہ خوشبو، وہ فرق بھی آ جائے، جو اصل عبارت میں موجود تھا۔''(4)

ترجمہ کے فنی مباحث سے قطع نظر افادی پہلوؤں کو دیکھا جائے تو ہر دور میں ادب کی ترقی تراجم کی مرہونِ منت رہی ہے۔ اسی راستے سے ہر عہد میں افکار ونظریات علمی و ادبی روایات اور تہذیب وتمدن کے رنگ ایک دوسرے تک پہنچتے آئے ہیں اور مستقبل میں بھی اس کے روشن امکانات موجود ہیں کیونکہ اس کے ذریعے قوموں اور تہذیبوں کا سنگم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر انیس ناگی کی رائے بجا کہتے ہیں کہ:

''دوسری زبانوں سے اپنی زبانوں میں ترجمے کا عمل دوسری تہذیب کو اپنی طرف کھینچ لانے کا عمل ہے۔ ترجمہ کا دوسرا رُخ اپنے آپ کو دوسری تہذیبوں تک لے جانے کا ہے۔''(5)

کم و بیش انہی خیالات کا اظہار سجاد حیدر پرویز کا بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ترجمہ ہر دور میں ہر زبان کی اہم ترین ضرورت رہا ہے۔ یہ مختلف قوموں، زبانوں اور ثقافتوں کے درمیان پڑے ہوئے اجنبیت کے پردے چاک کر کے انہیں ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔''(6)

قدیم سے جدید دور تک کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو انسانی تہذیب کی مجموعی ترقی میں تراجم کا بڑا ہاتھ نظر آتا ہے۔ یہ محض علوم کے فروغ کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ انسانوں کے درمیان ذہنی مفاہمت کے راستے ہموار کرنے میں مددگار بھی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد نے بڑی خوبصورتی سے ترجمے کی افادیت کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

''تخلیقی ادب کی عظمت کو تسلیم کرنا ضروری ہے مگر یہ کہنے سے تخلیقی ادب کی عظمت کی نفی نہیں ہوتی کہ تخلیقی ادب کی بہت سی اعلیٰ شکلوں کے پیچھے ترجمے یا اخذ شدہ چیزوں کی چمک بھی موجود ہے۔''(7)

شہباز حسین نے ترجمے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے ایسی ''کنجی'' کہا ہے کہ جس کے ذریعے علوم و فنون کے خزانے سب کیلئے کھل جاتے ہیں۔(8)

ترجمے کے ذریعے زبان نہ صرف ایک نئے مزاج سے روشناس ہو کر پھیلتی ہے بلکہ اس میں اظہارِ خیال کی نئی قوتیں اور امکانات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے نئے نئے خیالات بھی زبان میں دخیل ہوتے ہیں لہجوں اور جملوں کی نئی ساخت کو بھی زبانیں اپنے اندر سموتی ہیں اور یہ کام ایک مترجم کے ہاتھوں بڑی عمدگی سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقمطراز ہیں کہ:

''زبان کے مزاج کو بدلنے، اسے نئے امکانات اور طرزِ ادا کے نئے نئے

ڈھنگ سے روشناس کرانے میں اچھے مترجم کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ترجمہ کے ذریعے ایک زبان کی تہذیب دوسری زبان کی تہذیب کے ساتھ مل کر نئے گل کھلاسکتی ہے۔''(9)

گویا ترجمہ محدود یا جامد فن نہیں بلکہ وسیع اور ارتقا پذیر عمل ہے۔جس کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے۔ جب کوئی زبان اپنے ابتدائی مراحل میں ہوتی ہے تو وہ دیگر زبانوں کے ادب سے استفادہ کرتی ہے لیکن جب وہ ترقی یافتہ ہو جاتی ہے تو پھر اس کے ادب سے دوسری زبانوں کو سرمایہ دار کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ زبانوں کے علمی خزانوں کو بھر پور بنانے کا باعث بنتا ہے۔اس فن کے حوالے سے دنیا کی ہر زبان اور ادب میں مختلف تجربات کیئے جاتے ہیں۔

اردو زبان و ادب کا آغاز بھی بڑی حد تک تراجم کا مرہون منت رہا تاہم اس کے وسیع ہونے کے بعد دیگر زبانوں کے مترجمین نے بھی اردو کے اعلیٰ ادب کو اپنی اپنی زبانوں میں ڈھالا ہے۔خصوصاً شعر و ادب کی دنیا کے نابغۂ روزگار افراد کے کارناموں کو مختلف زبانوں کی زینت بنایا جا چکا ہے۔اس سلسلے میں مرزا غالب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ بلا مبالغہ ان کا اردو اور فارسی کلام اپنی مثال آپ ہے جسے نہ صرف اہل اردو بلکہ دیگر زبانوں کے افراد بھی اپنے لئے سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں۔غالب بلاشبہ نہایت مشکل شاعر ہے اور اپنی معنی آفرینی، جدتِ فکر اور طرز ادا کی وجہ سے شارحین اور مترجمین کیلئے تختہ مشق بنتا چلا آ رہا ہے۔اس بات کا احساس غالب کو خود بھی تھا خود ان کے بقول:

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا (10)

لہٰذا اس جیسے بلند پایہ شاعر کے کلام کو پنجابی میں منتقل کرنا اور اس کی آب و تاب کو قائم رکھنا نہایت دشوار کام ہے۔اس کے باوجود چند شعرا نے اپنے اپنے طور پر بھر پور کاوشیں کی ہیں۔اگرچہ ان مترجمین کی فہرست زیادہ طویل نہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہو رہا ہے بہر حال یہ نام غالب کو پنجابی میں متعارف کروانے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں کچھ کے تراجم طباعت و اشاعت کے مراحل سے گزر چکے ہیں مگر کچھ مترجمین کا کام ابھی تک گمنامی کے گوشوں میں مقید ہے۔مکمل کلام غالب کو منظوم پنجابی کی صورت دینے والوں میں تو صرف چند ایک نام سامنے

آتے ہیں۔ان میں سب سے نمایاں نام اسیر عابد کا ہے۔جنھوں نے تیرہ برس کی انتھک محنت کے بعد یہ ترجمہ پیش کیا تاہم ترجمے کا حق بھی ادا کر دیا۔ان کا یہ ترجمہ ''دیوان غالب، منظوم پنجابی ترجمہ'' کے عنوان سے مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے 1978ء میں شائع ہوا۔اس سے پہلے اس ترجمے کے کچھ حصے مختلف ماہناموں اور رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔مثلاً احمد ندیم قاسمی نے ''فنون'' میں اور عطاالحق قاسمی نے ''نوائے وقت'' میں اس کو مختلف اشاعتوں میں چھاپا۔علاوہ ازیں ''امروز'' کے ادبی صفحوں پر شفقت مرزا نے کئی تعارفی نوٹ بھی شائع کئے۔(11) مگر جب یہ ترجمہ کلی صورت میں قارئین تک پہنچا تو اسے بے حد پذیرائی ملی اور پنجابی زبان و ادب میں بہترین اضافہ قرار دیا گیا۔اس دیوان میں غالب کی تمام غزلیات کا ترجمہ کرنے کے بعد چار قصائد اور قطعات بھی شامل کئے گئے ہیں علاوہ ازیں آخر میں متفرق اشعار کے تراجم بھی کئے گئے ہیں۔اسیر عابد کے اس ترجمے پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو نہ صرف فنی وفکری حوالوں سے جامعیت کا حامل ہے بلکہ پنجابی تراجم کی روایت میں بھرپور اور منفرد اضافہ بھی ہے۔غالب کے خیالات و افکار کو جس خوبصورتی اور مہارت سے پنجابی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے وہ قاری پر یقیناً ایک سحر طاری کر دیتا ہے:

یہ مسائلِ تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

<u>ترجمہ:</u> تیرے ''ہو'' دے ویروے واہ سائیں، اُتوں غالبا کٹک بیان تیرا
جے کر پین دی تینوں نہ مار ہوندی، ساڈے لئی توں ولی اوتار ہوندا (12)

اس ترجمے کو پڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اسیر عابد نہ صرف فنی بلکہ فکری سطح پر بھی سایے کی طرح غالب کے پیچھے پیچھے چلتے نظر آتے ہیں۔احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے کہ:

''اگر غالب زندہ ہوتا اور اسے پنجابی سے شُد بُد ہوتی تو یہ ترجمہ سن کر وہ اسیر عابد کو سینے سے لگا لیتا۔''(13)

اس ترجمے کی اشاعتِ دوم جون 1997ء میں منظرِ عام پر آئی۔جس میں اسیر عابد نے پورے دیوان کے ترجمے پر نظرِ ثانی کرنے کے بعد کم از کم اسی،نوے اشعار کے تراجم میں تبدیلیاں کی ہیں۔بہتر سے بہتر کی تلاش کیلئے کہیں تو محض ایک دو لفظوں کی اور کہیں پورے پورے شعر میں تبدیلی

کی گئی ہے۔ وہ خود نئے سے نئے مترادفات کی تلاش کے تسلسل کو ''موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں'' قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ترجمے دے ایس عمل دا پینڈا امکن والا نہیں'' (14)۔ یہ تمام تبدیلیاں نہ صرف اسیر عابد کی پنجابی پر مکمل گرفت کا پتہ دیتی ہیں بلکہ فکرِ غالب کی گہرائی کو بھی اپنے اندر سموتی نظر آتی ہیں۔ ایک بڑی اہم اور نمایاں خوبی اس ترجمے میں موجود ہے وہ ہے اس میں عام فہمی اور سادہ زبان کا استعمال، مترجم نے بھرپور کوشش کی ہے کہ ترجمہ اصل متن کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ سریع الفہم اور پُر تاثیر الفاظ کا حامل بھی ہو۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تُو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

ترجمہ: مار بولیاں چاہنا ایں کم کڈھنا سئیں غالبا متے کوئی بھل ہووی
بے مہر، بے مہر، پیا آکھ کاہنوں ہووے کھجھ کے اوہ مہربان کاہنوں (15)

گویا اسیر عابد کے ترجمے میں لفظی کی بجائے بامحاورہ ترجمے کا رنگ نمایاں ہے۔ غالب جیسے بلند تخیل شاعر کے ہاں تراکیب، ضرب الامثال اور استعارات و کنایات کا ایک جہان آباد ہے یہ تراکیب زیادہ تر ایرانی تہذیب و تمدن سے آئی ہیں لہٰذا انھیں پنجابی کے قالب میں ڈھالنا یقیناً دشوار ترین کام ہے۔ اسیر عابد نے حتی الوسع پنجابی کے ایسے متبادل الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے غالب کے کلام کی معنویت اجاگر ہو سکے۔ ترجمہ کرتے ہوئے ان محاورات و ضرب الامثال کو اکثر جگہ پنجابی زبان میں اس طرح استعمال کیا ہے کہ پنجابی رنگ و آہنگ اور مزاج واضح طور پر جھلکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سعادت علی ثاقب:

> ''مرزا صاحب دیاں تصویراں نوں پنجابی زبان دے قالب وچ ڈھالدیاں اسیر عابد نے اوہدے وچ اپنی دھرتی دی واشنا رلا کے اوہنوں ہور وی سوادلا بنا چھڈیا اے۔'' (16)

مترجم نے تکرارِ لفظی اور تکرارِ حرفی کے استعمال سے بھی بہت سے اشعار کے تراجم کو دلکش رنگ دیا ہے۔

i- رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج

ترجمہ: صدمے سہند اسہند ابندہ آخر صدمے سہہ جاندا اے (17)

ii- واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار

ترجمہ: اوہدا دل ڈُب ڈُب جاندا، میں ایدھر ڈُب ڈُب جاندا (18)

مترجم کے ہاں جہاں پنجابی روزمرہ کا استعمال دلکشی کے ساتھ نظر آتا ہے وہیں اوزان و بحور میں بھی ترنم، موسیقیت اور روانی کا احساس در آیا ہے۔ پنجابی کے خالص پن اور خالص پنجابی تراکیب میں فکرِ غالب کو ڈھالتے ہوئے منفرد انداز اختیار کیا ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں تصرفات کرتے ہوئے لغزشوں کا شکار بھی ہوئے ہیں جس سے مفہوم میں تبدیلی بھی آئی ہے اور چند ایک جگہ تراجم میں خودساختہ تراکیب بھی محض لفظی بازیگری محسوس ہوتی ہیں۔ درج ذیل مثال سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے:

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

ترجمہ: کدوں سنے اوہ درد کہانی ساری میری
اُتوں اوہوی میرے مونہوں خواری میری (19)

لیکن ایسی مثالیں شاذو نادر ہی ملتی ہیں۔ مجموعی طور پر مترجم نے فکرِ غالب کو فنی وفکری ہر دو لحاظ سے عمدہ ترجمے کے رنگ میں ڈھالنے کی بھرپور سعی کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کا یہ ترجمہ بلاشبہ تمام خوبیاں اور جامعیت لئے ہوئے ہیں جو کہ اچھے مترجم کا خاصہ ہوتی ہیں۔

مکمل کلامِ غالب کو پنجابی روپ دینے والوں میں اسیر عابد کے بعد منظور احمد واصب کا نام آتا ہے اگرچہ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے مگر چونکہ یہ ترجمہ ابھی تک اشاعت وطباعت کے مراحل سے نہیں گزر سکا لہٰذا اہلِ علم وادب کی نظروں سے اوجھل ہے اسی بنا پر ان کا نام بھی ادب کی دنیا میں غیر

معروف ہے تاہم جو ایک آدھ غزل میسر آ سکی ہے اس کا ترجمہ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ مترجم نے اصل متن سے قریب رہتے ہوئے غالب کی پیش کردہ داخلی کیفیات کو سمجھ کر اسے من وعن ترجمے کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ درج ذیل چند مصرعوں سے اندازہ ہوتا ہے۔

i- دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک

ترجمہ: خاک خطے دے واسیو ویکھو

ii- کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب

ترجمہ: جگ نوں چا مُل چڑھے نہ غالب

ان کے اس ترجمے کو پڑھ کر لفظی رنگ نمایاں نظر آتا ہے کیونکہ اشعار میں محض لفظی تبدیلیوں پر زور دیا گیا ہے جو کہ اگرچہ خاص انفرادیت کی حامل تو نہیں مگر اس کے باوجود بعض جگہ عمدہ پنجابی تراکیب کی بدولت یہ ترجمہ واصب کے منفرد اسلوب کے ساتھ ان کی مشکل پسندی کی طرف اشارہ ضرور کرتا ہے۔ اگر اس ترجمے کو شائع کیا جائے تو یقیناً پنجابی کے قارئین کو فکر غالب سے قریب ہونے کا ایک بہتر ذریعہ میسر آ سکے گا۔ کلام غالب کو مکمل صورت میں پنجابی ترجمہ کرنے والوں میں ابھی تک کوئی اور نام منظر عام پر نہیں آ سکا۔ جس کی جانب اہل ادب کی توجہ کی ضرورت ہے۔ جزوی طور پر کلام غالب کے پنجابی ترجمہ نگاروں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ دلشاد کلانچوی اردو، پنجابی اور سرائیکی ادب سے قربت رکھنے والا ایسا نام ہے جنھوں نے غالب کے کلام کے منتخب حصوں کو اپنی ماں بولی (سرائیکی) میں منتقل کیا ہے۔ جو کہ نہ صرف اردو زبان کے قریب ہے بلکہ پنجابی زبان ہی کی ایک صورت ہے۔ دلشاد کے خیال میں:

> ''اردو سے یہ زبان بہت قریب ہے اگر اردو کے کسی فقرے کو ملتانی بہاولپوری لب و لہجے میں ادا کر دیا جائے تو وہ ملتانی بہاولپوری زبان کا فقرہ بن جاتا ہے۔''(20)

دلشاد کا یہ ترجمہ غالب کی 24 غزلیات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ''غالب دیاں غزلاں'' کے

نام سے 1969ء میں مکتبہ میری لائبریری کی جانب سے طبع ہوئی۔ دلشاد نے ترجمہ کرتے ہوئے اپنی علاقائی زبان (سرائیکی) کے لب و لہجے کو مکمل طور پر قائم رکھنے کی کوشش کی ہے جو اس لحاظ سے باقی تراجم سے منفرد کرتا ہے۔ فنی و فکری حوالے سے دیکھا جائے تو مترجم نے کوشش کی ہے کہ اصل متن کی بہت حد تک پیروی کی جائے۔ زیادہ تر ردائف اور اوزان و بحور اصل متن والی ہی استعمال کی ہیں محض لفظی تبدیلیوں پر زور دیا ہے بعض اشعار تو ان کے ہاں ایسے ہیں جن میں صرف اسما، افعال یا محض حروفِ عطف وغیرہ کو تبدیل کر کے سرائیکی (پنجابی) کا رنگ دے دیا ہے۔ مثلاً کا، کی، کے، کی بجائے دا، دی، دے اور ہوتا کی بجائے ہوندا، بہت کی بجائے بہوں وغیرہ کا استعمال زیادہ ہے۔ جس سے اس کا پہلا تاثر یہی اُبھرتا ہے کہ یہ لفظی ترجمہ ہے اور محض لفظوں پر لفظ بٹھانے کا کام کیا گیا ہے۔ یہ بات بہت حد تک درست بھی ہے۔ مثلاً

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ترجمہ: عاشقی منگے صبر، پر ہے تمنا بے تاب
دل دا کیا حال کراں خون جگر ہوون تئیں (21)

ان کے ترجمے میں یکسانیت کا احساس ضرور اُبھرتا ہے بلکہ بعض جگہوں پر تو مکھی پر مکھی مارنے والی مثال صادق آتی ہے۔ غالب کے ہاں موجود داخلی کیفیات اور فکری گہرائیوں تک پہنچ کر انھیں ترجمے کے قالب میں ڈھالنے کی جہاں تک بات ہے تو دلشاد کے ہاں اس حوالے سے کوئی خاص کاوش محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ سرائیکی لب و لہجے کی مٹھاس اور چاشنی کو ترجمے کا خاصہ بنانے میں مترجم نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ غالب کی استعمال کردہ تراکیب اور علامات کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی ان میں اگرچہ محض لفظی تبدیلیاں کی ہیں مگر یہ ان کا کمال ہے کہ صرف لب و لہجے کے فرق سے انھیں دلکش بنا دیا ہے۔ لب و لہجے کی اس چاشنی اور رچاؤ کے باعث ہی ترجمے کی بہت سی خامیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ترجمہ: ہک کھیڈ ہے بالاں دا ایہہ دنیا میڈے اگوں
تھیندا اپئے ایہہ ڈینہہ رات تماشا میڈے اگوں (22)

اپنے ترجمے کے حوالے سے ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ:

''منظوم تراجم کے سلسلے میں مَیں نے جو راستہ نکالا ہے وہ کچھ اُلٹا ہے اور میرے لئے سہل بھی۔ غزلیاتِ غالب کے اصلی نکھار کو قائم کرنے کی کوشش اور وہ بھی ایک ایسی زبان میں جسے علم و ادب میں کم دسترس حاصل ہے۔''(23)

کلانچوی کی یہ کاوش محض لفظی ترجمے کے طور پر قاری تک پہنچی ہے مگر اس میں موجود سرائیکی زبان کی ایک خاص مٹھاس، لذت اور خوبصورتی بھی ہمراہ ہے جو اسے منفرد بناتی ہے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر دلشاد کا یہ ترجمہ ایک لحاظ سے خاص اہمیت کا حامل بھی ہے کہ ان سے پہلے کلام غالب کے منظوم پنجابی تراجم کی کوئی روایت نہیں ملتی اور نہ ہی کوئی نمونہ کلام ان کے پیش نظر تھا لہٰذا ان کا یہ کام اولین کوشش تھی۔ پھر سرائیکی جیسی سریلی زبان میں کلام غالب کو ڈھال کر انھوں نے ایک عجیب چاشنی اور لطف کا سامان فراہم کیا ہے جو کہ لفظی ترجمہ ہونے کے باوجود اپنی جگہ گہرا اور عمدہ تاثر چھوڑتا ہے۔ اس لئے اسے آنے والوں کیلئے پیش خیمہ سمجھتے ہوئے سراہا جانا اس کا حق ہے۔

ترجمہ نگاری اور پھر غالب جیسے شاعر کی کوئی آسان کام نہیں مگر اس کے باوجود جزوی سطح پر کاوشیں کرنے والوں نے اپنی محنت کا ثبوت وقتاً فوقتاً پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے افضال احمد انور کا نام بھی اہم ہے جنھوں نے غزلیات غالب کے منتخب حصوں کو پنجابی قالب پہنا کر وقتاً فوقتاً مختلف رسائل و جرائد میں چھپوایا ہے مثلاً غالب کی دو غزلیات کے تراجم ''Daily Business Report'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ اس کام کو مستقبل میں جاری رکھنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ افضال کے ان تراجم کا مطالعہ کرنے سے ان کی غالب شناسی کا پتہ چلتا ہے۔ غالب

کو نہایت اہم لفظ شناس شاعر سمجھا جاتا ہے اور اس خصوصیت کی پیروی کرنے کا احساس افضال کے ہاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے غالب کی فکر کے ساتھ ساتھ ان کی تراکیب اور الفاظ کو بڑے عمدہ انداز میں پنجابی متبادلات میں ڈھالا ہے۔ اکثر اشعار میں ٹھیٹھ پنجابی اور عام فہم تراکیب کا استعمال کر کے ترجمے میں جان پیدا کی ہے:

ع زخم کے بڑھنے تلک، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

ترجمہ: پھٹ تے سکڑ آن تیکر، نونہہ نہ ودھ جاون گے کیہ

ع دوست غم خواری میں میری سعی فرماویں گے کیا

ترجمہ: لا کے ٹل وی یار میرے غم نوں ونڈاون گے کیہ؟

مترجم نے اصل تخلیق میں چھپی روح کو اپنے ترجمے میں سمونے کی کوشش تو کی ہے تاہم چند ایک اشعار میں تصرفات کرنے سے ترجمے کے تاثر اور معنی میں فرق آیا ہے اور اصل تاثر ترجمے میں آکر بدل جاتا ہے۔ اس مثال سے واضح ہے کہ شعر کا داخلی رنگ خاصا متاثر ہوا ہے۔

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

ترجمہ: ٹور اس دی کمان چڑھیا تیر
ایہو جیہئے دے دلیں وسے کیہڑا

ان چند خامیوں سے قطع نظر یہ ترجمہ روانی اور سادگی کی اچھی مثال ہے۔ جزوی ہونے کے باوجود غالب شناسی کے تسلسل کی اہم کڑی سمجھی جا سکتی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ مترجم اس کام کو مستقبل میں بھی آگے لے کر بڑھتا رہے۔ غالب شناسی کے اس عمل میں چند ایک نام ایسے ہیں جنھوں نے صرف چند ایک منتخب غزلیات کو پنجابی روپ دیا ہے۔ یہ بھی اگرچہ غیر مطبوعہ ہیں تاہم راقم نے تحقیق کے بعد ان تک رسائی حاصل کی ہے۔ ان میں سلیم کاشر کی ترجمہ کردہ غزل ہے، جس میں مترجم نے پنجابی میں مستعمل ''وارث شاہی بحر'' کا بڑا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ اس ایک غزل کو

پڑھ کر ہی کاشر کی پنجابی پر مہارت اور غالب سے رغبت کا علم ہو جاتا ہے۔

ع ترے نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہدِ بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا ، اگر استوار ہوتا

ترجمہ: تیری طبع نازک صاف بولدی اے جھوٹھے وعدیاں تے رہیا ٹالدا توں
کیویں توڑدا سوہنیا بول تے سہی عہد پیار دا جے پائیدار ہوندا

مترجم نے غالب کے فکری عناصر کو بھی سمجھا ہے اور سادہ زبان کے استعمال سے اس کی اصل روح تک پہنچنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ رواں اور عام فہم پنجابی لہجے نے ترجمہ کردہ غزل میں ایک خاص ترنم کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ کلام غالب کے منظوم پنجابی تراجم (جزوی) کے سلسلے میں سعادت علی ثاقب کا نام بھی شامل ہے۔ غالب کے حوالے سے ان کا تحقیقی نوعیت کا کام بھی بہت اہم ہے۔ انھوں نے منتخب غزلیات غالب کو پنجابی کا لبادہ پہناتے ہوئے ٹھیٹھ اور عام فہم لب و لہجہ کو اپنایا ہے۔

ع کہ زمین ہوگئی ہے سر تا سر
روکش سطح چرخ مینائی

ترجمہ: دھرتی اک پاسوں دوئی توڑی
امبر ول اکھاں اٹکائیاں

ثاقب کے ہاں ترجمے کا صوتی آہنگ اور تاثر بھی دلکش ہے۔ انھیں اس حوالے سے مزید کام کرنے پر توجہ دینی چاہیئے۔ تاکہ پنجابی قارئین کیلئے غالب فہمی کو آسان بنانے میں وہ اپنا کردار ادا کر سکیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ غالب کا فارسی کلام اپنی مثال آپ ہے اور خود غالب کو اپنی فارسی دانی پر فخر تھا۔ چند ایک ترجمہ نگاروں نے غالب کے فارسی کلام کے منتخب حصوں کو پنجابی قالب میں ڈھالا ہے۔ اس حوالے سے اہم نام صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کا ہے۔ ان کے تحریر کردہ یہ تراجم ان کی کتاب ''نظراں کردیاں گلاں'' میں موجود ہیں۔ نہایت پر اثر اور دلکش انداز میں افکار غالب کو پنجابی کا روپ

دیا ہے کہ پڑھنے والا جھوم اُٹھتا ہے۔ یہ تراجم اگرچہ بہت کم ہیں مگر ان چند مثالوں سے ہی ان کی پنجابی لفظیات پر عبور و مہارت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔

ع حصار عافیتی گر ہوس کنی غالب

چو مابہ حلقۂ رندان خاکسار بیا

ترجمہ: سکھی وسنا جے توں چاہونا ایں میرے غالبا ایس جہان اندر

آ جا رنداں دی بزم وچ آ بہہ جا، ایتھے بیٹھدے نیں خاکسار آ جا(24)

صوفی تبسم اردو، پنجابی اور فارسی تینوں کے استاد شاعر ہیں لہٰذا یقیناً یہ تراجم ان کی غالب شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے ترجمے کے دوران خاص پنجابی ثقافت اور کلچر میں مستعمل الفاظ کا اہتمام کیا ہے جس سے ایک خاص لطف اور تاثیر ترجمے کا حصہ بنتی نظر آتی ہے:

ع دمید دانہ بالید و آشیاں گہ شد

در انتظار ہما دام چیدنم بنگر

ترجمہ: دانہ پھٹیا، اُگیا، رُکھ بنیا، آ کے آہلنے پا لئے پنچھیاں نیں

جال سٹ کے اجے اڈیکنا اے، کدی پھسے گا آن ہما پیارے (25)

صوفی تبسم کے ان تراجم کو پڑھ کر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر وہ تراجم کے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے تو اس میدان میں بھی صف اول میں جگہ پاتے۔ درج بالا تمام تراجم کے علاوہ بھی بہت سے نام ایسے ہیں جنھوں نے جزوی طور پر کلام غالب کو پنجابی روپ میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے تاہم یہ تراجم زیادہ تر غیر مطبوعہ ہیں جس کے باعث اہل علم کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ درج بالا مجموعی جائزہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کلامِ غالب کے منظوم پنجابی تراجم کی روایت وقت کے ساتھ ساتھ مستحکم صورت میں ڈھلتی جا رہی ہے۔ آفاقی شاعر غالب کے افکار و خیالات کا دائرہ ان تراجم کے ذریعے پھیلتا جا رہا ہے، جو کہ خوش آئند بات ہے۔ اس سے نہ صرف غالب کے افکار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ پنجابی کا دامن بھی مزید وسیع ہوتا ہے۔ امید واثق ہے کہ مستقبل میں بھی مترجمین کی توجہ اس جانب مبذول رہے گی تا کہ ادب کا یہ پہلو مزید زرخیز ہو سکے۔

حوالہ جات

1- عطش درانی، (فنِ ترجمہ اصول و مبادی) مشمولہ، ترجمے کا فن، مرزا حامد بیگ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1987ء، ص129

2- مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1988ء، ص5

3- ڈاکٹر سہیل احمد خان، (ترجمہ، تالیف، تلخیص اور اخذ کرنے کا فن) مشمولہ، ترجمہ، روایت اور فن، نثار احمد قریشی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، 1985ء، ص68

4- سید عابد حسین، بحوالہ، اردو اور سرائیکی کے باہم تراجم، سجاد حیدر پرویز، ملتان: سرائیکی ادبی بورڈ، 2001ء، ص12

5- ڈاکٹر انیس ناگی، مضمون ''ترجمے کی ضرورت''، (مشمولہ) ترجمہ، روایت اور فن، ص35

6- سجاد حیدر پرویز، اردو اور سرائیکی کے باہم تراجم، ص12

7- ڈاکٹر سہیل احمد خان، بحوالہ، ترجمہ، روایت اور فن، ص67

8- شہباز حسین، بحوالہ، ترجمہ کافن اور روایت، ص181

9- ڈاکٹر جمیل جالبی، مضمون، ترجمے کے مسائل، (مشمولہ) ترجمہ، روایت اور فن

10- اسیر عابد، دیوان غالب، منظوم پنجابی ترجمہ، لاہور: مجلس ترقی ادب، ص32

11- اسیر عابد، دیوانِ غالب، منظوم پنجابی ترجمہ، ص27

12- ایضاً ص71 13- ایضاً ص20

14- ایضاً ص29 15- ایضاً ص245

16- سعادت علی ثاقب، حرف حوالے، فیصل آباد: صوفی عنایت اکیڈمی، 2000ء، ص131

17- اسیر عابد، دیوانِ غالب، منظوم پنجابی ترجمہ، ص216

18- ایضاً ص237 19- ایضاً ص348

20- دلشاد کلانچوی، غالب دیاں غزلاں، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، 1969ء، ص11

21- ایضاً ص40 22- ایضاً ص75 23- ایضاً ص17

24- صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، نظراں کردیاں گلاں، لاہور: پنجابی ادبی بورڈ، 1988ء، ص128

25- ایضاً ص129